عراق: آخری موقع

تحریر: رابرٹ زیلِنِك*

ترجمہ وتلخیص: ثروت جمال اصمعی

عراق کی جنگ امریکا کی بھاری غلطی تھی، یہ ماننے کے باوجود یہ سمجھنا درست نہیں کہ عراق سے امریکی افواج کی فوری واپسی یا اس کے لیے کسی موزوں تاریخ کا تعین امریکا کے مفاد میں ہے۔ صدام کے مہلک ہتھیاروں کے بارے میں غلط معلومات، غیر متوقع طور پر شدید مزاحمت اور فرقہ واریت و خانہ جنگی کے سنگین مسائل، ان سب حوالوں سے غلطیوں کے باوجود امریکا کا عراق چھوڑ دینا مسئلے کا حل نہیں۔ بڑی طاقتیں جب کسی معاملے میں مداخلت کرتی ہیں تو انہیں اسے ٹھیک بھی کرنا چاہیے۔ بیمار عضو کو کاٹ پھینکنے کے بجائے ممکن ہو تو اس کا علاج ضروری ہے۔

اگست ۲۰۰۶ء کا بیشتر وقت میں نے عراق میں گزارا اور امریکی فوجیوں، سفارتی شخصیات اور عراقی صحافیوں وغیرہ سے بات چیت کر کے صورت حال سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دو دن کرکوک میں بھی گزارے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو نئے عراق کی صورت گری میں اہم کردار ادا کرے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ عراق میں ناکامی اب زیادہ دیر چھپائی نہیں جا سکتی۔ بغداد آج دنیا کی ایک بہت بڑی قتل گاہ ہے اور سنیوں کے مرکزی علاقے میں الانبار کا صوبہ ایک ایسی خونریز صورت حال میں گھرا ہوا ہے جس سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان باتوں سے کسی کو متاثر نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارہ میں سے چودہ صوبوں میں حالات بہتر ہیں۔ میں نے جن لوگوں سے بات

---

*رابرٹ زیلِنِک بوسٹن یونیورسٹی کے شعبہ قومی و بین الاقوامی معاملات' میں بطور پروفیسر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا زیر مطالعہ مضمون 'پالیسی ریویو' کے شمارہ دسمبر ۲۰۰۶ء-جنوری ۲۰۰۷ء سے منتخب کیا گیا ہے۔

چیت کی وہ اس پر متفق تھے کہ حالات میں جلد نمایاں بہتری نہ آئی تو امریکی افواج کی واپسی کے مطالبے میں نا قابل مزاحمت شدت پیدا ہو جائے گی۔تاہم ساری ذمہ داری امریکا اور اتحادیوں ہی کی نہیں ہے۔عراقی حکومت خود مختار اور عالمی سطح پر مسلمہ حیثیت کی حامل ہے۔تمام بڑے فیصلے جن سے ملک قائم رہ سکتا یا ٹوٹ سکتا ہے،عراقیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ان میں باہمی مفاہمت،وفاق کا معاملہ، تیل کے محصولات کی تقسیم، کرکوک کی حیثیت اور فرقہ وارانہ ملیشیاؤں کا مستقبل جیسے امور شامل ہیں۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جنرل Casey نے کہا''ہم سب کچھ ٹھیک کرنے کے بعد بھی ہار سکتے ہیں۔'' تاہم مقاصد کے بہترین طور پر حصول میں ناکامی اور شکست میں بہر حال فرق ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بغداد میں حالات کی ابتری فروری (۲۰۰۶ء) میں سامراء کی مسجد عسکری میں بم دھماکوں سے شروع ہوئی مگر حقیقت یہ ہے ۲۰۰۳ء میں امریکی حملے کے کچھ دن بعد ہی سے سیکوریٹی کی صورت حال خراب ہونا شروع ہوگئی تھی۔امریکی جو ابتدائی دنوں میں آزادی سے نقل وحرکت کر سکتے تھے، کچھ ہی عرصے بعد ان کے لیے حفاظتی انتظامات بتدریج ضروری ہوتے چلے گئے۔اور اب حالات اس حد تک ابتر ہیں کہ لاکھوں شیعہ اور سنی مجبوراً اپنے گھر چھوڑ کے محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکے ہیں۔جنہوں نے اپنے گھر نہیں چھوڑے وہ ہر لمحہ تشدد کے خطرے سے دوچار ہیں۔بہت اچھے علاقوں میں بھی لوگوں کو پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولتیں دستیاب نہیں ہیں۔قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ لوگ کیوں قتل کیے جا رہے ہیں۔اگر چہ یہ طے کرنا محال ہے کہ کون فرقہ وارانہ منافرت کا نشانہ بنا اور کون کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھا۔تاہم یہ بات عموماً سب مانتے ہیں کہ مسئلے کی جڑ پرائیویٹ ملیشیا یعنی نجی مسلح تنظیمیں ہیں۔بغداد میں تقریباً دودرجن ملیشیا تنظیمیں حالات کو بگاڑنے میں شریک ہیں۔ان میں سے بیشتر اگر شیعہ سیاسی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ نہیں تو اس سے بہت قریب ضرور ہیں۔مزید پیچیدگی نجی مسلح محافظوں نے پیدا کردی ہے جو ہر رکن پارلیمنٹ، ہر وزیر اور سیاسی جماعتوں کے بیشتر عہدیداروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔یہ لوگ اپنی وردی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قتل، اغواء اور لوٹ مار کی کارروائیاں اپنے طور پر بھی کرتے ہیں اور کرائے کے مجرم کا کردار بھی

ادا کرتے ہیں۔حالات کی بہتری کے لیے ان نجی مسلح تنظیموں اور ذاتی محافظوں کے سلسلے کا ختم ہونا ضروری ہے۔

ملیشیاؤں کا مسئلہ برسوں سے چل رہا ہے۔ان میں سے بعض بڑی تنظیمیں حزب اللہ کے طرز پر کام کرتے ہوئے عام لوگوں کو تحفظ اور سماجی خدمات کے ضمن میں زندگی کی وہ بنیادی ضروریات فراہم کر رہی ہیں جو حکومت نہیں کر پا رہی ہے۔بغداد میں بجلی چوبیس گھنٹے میں دو چار گھنٹے کے لیے فراہم کی جاتی ہے۔مگر ایک رات میں نے الرشید ہوٹل کی تیرھویں منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو علاقہ روشن تھا۔میں نے ایک عراقی ترجمان سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اکثر علاقوں میں فرقہ وارانہ ملیشیا تنظیموں نے جنریٹر کے ذریعے بجلی کی فراہمی کا انتظام کر رکھا ہے۔

سب سے بڑی ملیشیا بدر آرگنائیزیشن برائے تعمیر و ترقی ہے۔۔ایران کے پاسداران انقلاب اسلامی نے عراق کے جنگی قیدیوں اور باغیوں کی تربیت اور مالی تعاون کے ذریعے 88-1980ء کی ایران۔عراق جنگ کے دوران اس کی بنیاد رکھی تھی۔پھر عراق کی سب سے بڑی جماعت سپریم کونسل برائے اسلامی انقلاب نے اس کو اپنا لیا جس کے سربراہ عبدالعزیز الحکیم ہیں۔اس کے بعد یہ تنظیم سابق وزیر داخلہ بایان جبر کے کنٹرول میں آگئی۔سنیوں کو سخت شکایت ہے کہ یہ تنظیم ان کے خلاف قتل، اغواء اور خوف و ہراس پھیلانے کی سرگرمیوں میں بڑے پیمانے پر ملوث ہے۔مگر شیعہ لیڈر اس سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے لوگوں کو سنیوں کی دہشت گردی سے تحفظ دینے کے لیے یہ ملیشیا تنظیمیں ضروری ہیں۔وہ وعدے کرتے ہیں کہ ان تنظیموں کو سرکاری سیکوریٹی فورس میں شامل کر لیا جائے گا یا ختم کر دیا جائے گا، مگر ان وعدوں پر اب تک عمل نہیں ہوا۔مہدی آرمی، مقتدیٰ الصدر کی تنظیم ہے اور بغداد کے صدر سٹی علاوہ جنوب کے غریب شیعہ شہروں میں زیادہ مقبول ہے۔2004ء میں امریکی افواج کا اس تنظیم سے دوبار تصادم ہو چکا ہے۔مقتدیٰ الصدر کی ترجیحات میں امریکا کی جلد واپسی سرفہرست ہے۔سنیوں کے لیے وہ اس امید کے ساتھ کلی عام معافی کے علمبردار ہیں کہ اس طرح ان کی شورش ختم ہو سکے گی۔وہ عراق کو تیزی سے وفاق میں بدلنے کے عبدالعزیز حکیم کے اس منصوبے

کے حامی نہیں ہیں جس کے نتیجے میں جنوبی علاقے کے تیل کے وسیع ذخائر 9 اکثریتی شیعہ صوبوں کے پاس آجائیں گے۔ وہ اس بارے میں بات چیت کو دو سال کے لیے مؤخر کر دینے کے حق میں ہیں۔ تاہم مقتدیٰ الصدر کے بعض معاملات میں اس لچکدار رویے کے باوجود ان کی ملیشیا بغداد کی تباہ حال غریب بستیوں میں فرقہ وارانہ صفائے کے عمل میں سفاک قاتل کا کردار ادا کر رہی ہے۔ دیگر شیعہ ملیشیا تنظیمیں اتحادی افواج کے ساتھ ربط ضبط کے سبب نمایاں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک وولف بریگیڈ کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ بدر آرگنائزیشن کی شاخ ہے۔ اس کے ارکان نے دہشت گردوں کی گرفتاری اور ان سے اعتراف جرم کرانے میں حصہ لیا تاہم سنی رہنما اس پر غیر قانونی گرفتاریوں، ٹارچر اور قتل عام میں ملوث ہونے کے الزامات لگاتے ہیں۔ سنیوں کی سب سے بڑی ملیشیا کا نام عمر بریگیڈ ہے۔ یہ 2005ء میں شیعہ ملیشیاؤں کی سرگرمیوں کے جواب میں قائم ہوئی۔ اس کی سرگرمیاں بنیادی طور پر مغربی بغداد کے سنی اکثریت کے اضلاع تک محدود ہیں۔ یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ عمر بریگیڈ نے القاعدہ سے الحاق پسند کیا۔ اتحادی کمانڈروں کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ مقامی سنی باغیوں کا تعلق عالمی جہادیوں سے ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں انہیں وسائل اور افرادی قوت کے لامحدود ذرائع میسر آسکتے ہیں۔ اسی طرح القاعدہ کو عراق میں رضا کاروں کی بھرتی اور تربیت وغیرہ کی ویسی ہی سہولتیں میسر آسکتی ہیں جیسی طالبان دور میں افغانستان میں حاصل تھیں۔ امریکی حملے سے پہلے کی ملیشیا تنظیموں کا ان کی سماجی خدمات کی وجہ سے بہرصورت ایک جواز ہے، تاہم اس کے بعد جو ملیشیا تنظیمیں بنی ہیں ان میں سے بیشتر 2003ء کے بعد کی سیاسی صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ آبادی کے ہر طبقے نے اختیارات کی تقسیم میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے یہ تنظیمیں قائم کی ہیں۔ تیل کی دولت میں اپنا حصہ وصول کرنا اس رجحان کا بنیادی سبب ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسجد عسکری میں بم دھماکوں نے شیعہ سنی کشیدگی کو ابھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اتحادی افواج کے سیکنڈ ان کمانڈ برطانوی جنرل رابرٹ فرائی کے بقول عراقی شیعہ ہمیشہ سے یہ نقطہ نظر رکھتے تھے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن سامراء کے بم دھماکوں

نے ان کی سوچ بدل کر رکھ دی۔ اس واقعے کے بعد اپنے سنی ہم وطنوں کے خلاف ان کا غیظ وغضب بھڑک اٹھا اور غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ سنیوں کی طرف سے بھی جوابی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد میں ماہ بماہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور صرف جولائی (۲۰۰۶ء) میں بغداد کے 3200 شہری اس باہمی جنگ کا نشانہ بنے۔ وزیراعظم نوری المالکی نے اس باہمی تشدد کے آغاز پر کہا تھا کہ بغداد کی سلامتی ان کی پہلی ترجیح ہے مگر حکمراں اتحاد کی ایک چھوٹی پارٹی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ غیر مؤثر ہیں اور ان بڑی جماعتوں کے دباؤ قبول کرنے پر مجبور ہیں جو کلیدی ملیشیا تنظیموں کو کنٹرول کرتی ہیں۔ سیکوریٹی فورسز کے علاوہ عراق کا عدالتی نظام بھی وزیراعظم مالکی کا مددگار نہیں ہے۔ پکڑے جانے والے بیشتر مجرم عدالتوں سے مختصر سزاؤں کے بعد چھوٹ جاتے ہیں۔ عراقی فوج جسے تین مراحل میں تیار کیا جانا تھا، اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہورہا ہے۔ اس سال کے آخر تک عراقی فوج کی نفری ایک لاکھ ساٹھ ہزار تک پہنچ جائے گی۔ مگر یہ فوج نہ ''قومی'' ہے نہ ''پیشہ ور''۔ اس کے دس میں سے پانچ ڈویژن نیشنل گارڈ یونٹس پر مشتمل ہیں چنانچہ ان پر مقامی رنگ غالب ہے۔ دو یونٹ ''پیش مرگا'' کے نام سے معروف سابق کرد ملیشیا کے ہیں لہٰذا عراق کی قومی ریاست سے ان کا وفادار ہونا بہت مشکل ہے۔ اس فوج کے لیے اب تک یکساں قواعد وضوابط بھی وضع نہیں کیے جاسکے۔ محاسبے کا عملاً کوئی نظام نہیں ہے۔ یہ فوج باغیوں اور جرائم پیشہ گروہوں پر قابو پانے میں بالکل ناکام ہے۔ جیل خانے گنجائش سے زیادہ بھرے ہوئے ہیں۔ عدالتیں بدعنوان ہیں۔ لوگوں کو نہ فوج پر اعتماد ہے، نہ امریکا پر اور نہ مالکی حکومت پر۔ تشدد پسندوں کی کارروائیاں جاری ہیں اور بغداد اس کے نتائج بھگت رہا ہے۔

وزیراعظم مالکی کی ناکامی اور ایوان نمائندگان کے اجلاس معطل ہونے کی بناء پر جنرل کیسی نے ایک جوا یہ کھیلا کہ تین مزید بریگیڈ بغداد میں تعینات کردیے تاکہ زیادہ متاثرہ ضلعوں دُورہ، ماریہ اور غزالیہ میں حالات پر قابو پایا جاسکے۔ ان میں سے دو بریگیڈ عراقی اور ایک امریکی ہے۔ اس اقدام کے لیے انبار کے صوبے سے فوج بغداد منتقل کی گئی جہاں خود-- انٹیلیجنس کی رپورٹوں کے مطابق-- دشمن

سے نمٹنے لیے نفری میں ایک مزید ڈویژن کا اضافہ ضروری ہے۔مگر بغداد کی صورت حال بھی امریکی فوج میں اضافے کی متقاضی ہے۔تاہم یہ اقدام امریکی شہریوں کا صبر آزمانے کے مترادف ہوگا۔اس مشترکہ کارروائی--- آپریشن فارورڈ ٹوگیدر--- کا آغاز ضلع دُورہ سے کیا گیا۔اس کے دوران گھر گھر تلاشی لی گئی اور ناجائز اسلحہ ضبط کیا گیا۔لوگوں سے علاقے میں ملیشیا تنظیموں کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔فوج نے لوگوں کو روزمرہ زندگی کی سہولتوں کی فراہمی میں بھی حصہ لیا۔اس کے نتیجے میں معاملات کچھ دن بہتر رہے تاہم ملیشیا تنظیموں کی کارروائیاں بتدریج بحال ہوتی گئیں اور حالات پھر خراب ہوگئے۔حال ہی میں امریکا نے ملائیشیا تنظیموں کو عراقیوں کا اپنا مسئلہ قرار دے کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عراقی حکومت نے 2004ء میں مقتدیٰ الصدر کی مہدی آرمی سے اتحادی افواج کے تصادم کے چند ہی ہفتوں بعد شیعہ اکثریت کے علاقوں میں ملیشیاؤں سے نمٹنے کے لیے اتحادی افواج کی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنی شروع کردی تھی ۔اس کے بعد مالکی حکومت سے ایک معاہدے کے تحت طے پایا تھا کہ اتحادی افواج حکومت سے اجازت لیے بغیر کسی ملیشیا کے خلاف اقدام نہیں کریں گی۔اس کے بعد سے کسی ملیشیا کے خلاف کارروائی نہیں ہوئی۔جنرل کیسی نے گزشتہ اگست میں ملیشیا تنظیموں کے بارے میں سخت منفی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگوں کے لیے سلامتی کا ذریعہ نہیں ہیں اور جو لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں وہ بے عقلی کی بات کرتے ہیں۔تاہم عراق میں امریکی فوجی قیادت اب ملیشیا تنظیموں کو غیر مسلح کرنے کے معاملے کو عراقی حکومت پر چھوڑ دینے کی حامی ہے۔

عراق حکومت یہ قدم کب اٹھائے گی؟اس سوال کا فی الحال کوئی جواب دستیاب نہیں۔اس ضمن میں ایک پانچ نکاتی منصوبہ عبوری اتحادی اتھارٹی کے دور ہی سے تیار ہے مگر اب تک اسے عملی جامہ پہنانے کی کوئی خاص کوشش نہیں ہوئی۔اس منصوبے میں ملیشیاؤں کے بیشتر وابستگان کو باقاعدہ فوج میں ضم کرنا، دیگر کو شہری سہولتوں کی فراہمی کی تربیت دینا، باقی افراد کو پنشن دے کر فارغ کیا جانا، ان کے پاس موجود زائد ہتھیاروں کا حکومت کی جانب سے خرید لیا جانا، اور پانی اور جنریٹرز وغیرہ جیسی جو

سہولتیں ملیشیا تنظیمیں لوگوں کو فراہم کر رہی ہیں ان کے بجائے حکومت کی جانب سے ان کی فراہمی کا بند و بست کیا جانا شامل تھا۔ عراقی سیکوریٹی فورسز کے تربیتی پروگرام کے انچارج لیفٹننٹ جنرل مارٹن ڈیمپسی نے اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ملیشیاؤں سے نمٹنے میں حکومت کی عدم دلچسپی کی وجہ سے سپاہیوں کو یہ یقین نہیں کہ انہیں ان کے خلاف کارروائی کی صورت میں حکومت کی حمایت حاصل ہوگی یا نہیں۔ اس لیے مہدی، بدر اور بڑی سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والی دیگر ملیشیا تنظیموں کو چیک پوسٹوں اور بغداد کی بستیوں میں پرتشدد سرگرمیوں میں مصروف دیکھنے کے باوجود وہ ان کے خلاف کارروائی سے احتراز کرتے ہیں۔ اس بناء پر آپریشن فارورڈ ٹوگیدر معطل ہوگیا اور دہشت گردی بڑھتی رہی۔

عراق کی موجودہ صورت حال کتابی تعریفوں کی رو سے خانہ جنگی ہو یا نہ ہو، عملاً خانہ جنگی ہی ہے۔ بغداد کا اصل مسئلہ تو فرقہ وارانہ اختلافات ہیں مگر دارالحکومت سے باہر بعض دیگر معاملات زیادہ اہم ہیں۔ ایک انٹیلیجنس افسر کے بقول ''اس ملک میں تین مختلف جنگیں جاری ہیں۔ کردوں کی تحریک آزادی، حکومت کے خلاف شورش اور اُس حکومتی ڈھانچے کو ڈھانے کی جدوجہد جس پر بعث پارٹی کے وابستگان کا غلبہ تھا، موت کے دستے اسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں ہیں کہ سنی دوبارہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔'' تشدد کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش ان تینوں عناصر اور ان کے باہمی تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر شیعہ اپنی ملیشیا تنظیموں کو اس وقت تک غیر مسلح کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں گے جب تک حکومت کے خلاف شورش ختم نہ ہو جائے، اور شورش کرنے والے اس وقت تک ہتھیار نہیں ڈالیں گے جب تک انہیں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ شمال کے کرد اور جنوب کے شیعہ تیل کی دولت سے تمام عراقیوں کے یکساں استفادے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ جنرل ڈیمپسی نے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ''میں اور تم اور وزیر اعظم مالکی القاعدہ سے کسی سیاسی حل کی بات کرنے نہیں جا رہے ہیں مگر عراق میں باقی جنگ زیادہ تر حکومت کے اختیارات کی تقسیم اور ایک ایسی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے جسے عوام کے تمام طبقوں کا

اعتبار اور اعتماد حاصل ہو۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حکومت کو اس عمل یعنی قومی مفاہمت تک پہنچنے کے لیے وقت دیں۔ جب تک وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں یا اس حوالے سے اپنی نارضامندی ظاہر نہ کر دیں، ہم معاملات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔''

۲۵ جون کو وزیر اعظم مالکی نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے ایک ۲۴ نکاتی مفاہمتی منصوبہ پیش کیا۔ اس میں باغیوں کو عام معافی، حکومت میں شمولیت اور نقصانات کی تلافی کا ایک مبہم سا پیکیج پیش کیا گیا تھا۔ مگر بعد کے مہینوں میں اس پیکیج کے نکات کے مطابق عمل کی کوشش اتنی کم ہوئی کہ یہ بالکل غیر موثر ہو گیا۔ شیعہ جماعتوں کے دباؤ کے نتیجے میں مالکی کو عام معافی کے اعلان کو عملاً ''بے گناہوں کے لیے معافی'' میں بدلنا پڑا۔ وضاحت کی گئی کہ یہ معافی ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے دہشت گردی اور مجرمانہ سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا اور انسانیت کے خلاف کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوئے۔ صدام کے حامیوں کو بھی عام معافی سے باہر رکھنے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح یہ معافی عملاً ان ہی کے لیے رہ گئی جو امریکی فوجیوں سے برسر جنگ ہیں یا رہ چکے ہیں۔ امریکی سینیٹر کارل ایم لیون نے فوکس نیوز سے بات کرتے ہوئے اس صورت حال پر کہا کہ ''ہم نے اس ملک کو آزاد کرایا، ہم نے اسے ایک خوفناک آمر سے نجات دلائی۔ ڈھائی ہزار امریکی فوجیوں کی جانوں کی صورت میں ہم نے اس عمل کی بھاری قیمت ادا کی۔ اور اب ان لوگوں کو عام معافی کی پیش کش کی جا رہی ہے جنھوں نے اپنے ملک کو آزاد کرانے والوں کو قتل کیا! یہ بات ناقابل قبول ہے۔''

تاہم جو لوگ عام معافی کے منتظر ہیں ان میں بڑی تعداد مسلح جنگجوؤں کی نہیں سول سرونٹس کی ہے۔ مملکت کا کاروبار چلانے میں تجربہ کار سرکاری ملازمین کی کمی بری طرح محسوس کی جا رہی ہے۔ تیل، گیس، زراعت، پانی، بجلی اور تمام سرکاری محکمے زبوں حالی کا شکار ہیں۔ حکومتوں کو دشمن سے زیادہ نقصان نااہلی اور بدعنوانی سے پہنچتا ہے۔ حکومتی امور کامیابی سے چلانے کے لیے تجربہ کار سنی بیوروکریسی کا انتظامیہ میں واپس لایا جانا حکومت کی اولین ترجیح ہونا چاہیے۔ بیرونی جہادیوں کی قتل و غارت گری کی صلاحیت سے انکار ممکن نہیں تاہم اگر سنی سول سرونٹس سسٹم کا حصہ بن جائیں اور بیرونی

جہادیوں کے ساتھ تعاون سے انکار کردیں تو یہ جنگ وہ ہار جائیں گے۔ مگر مالکی بڑی شیعہ جماعتوں کی حمایت نہ ملنے کی وجہ سے اپنے مفاہمتی پروگرام کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر سکے۔ سنیوں کے سب سے بڑے پارلیمانی بلاک نے اس پروگرام کی حمایت کی تھی مگر مالکی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے اندر اس کام کو کرنے کی کوئی حقیقی خواہش اور کوئی سیاسی عزم دکھائی نہیں دیتا۔

نوری المالکی کے ایک سینئر مشیر نے -- اس اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہ عراق شیعہ، سنی اور کرد ریاستوں کی صورت میں تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا ہے -- کہا کہ 1920ء میں وجود میں آنے والے ایک عراق کے نقشے کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں مفاہمت، مکالمے اور پل بنانے کی ضرورت ہے۔ اب یہ وزیر اعظم مالکی اور ان کے ساتھیوں پر ہے کہ وہ ایسا پرکشش پیکیج سامنے لائیں جو سنیوں کو بغاوت ترک کر دینے اور قومی دھارے میں شامل ہونے پر آمادہ کر کے القاعدہ اور دیگر بیرونی جہادیوں کو اس جنگ میں تنہا کر دینے کا ذریعہ بن سکے۔ مگر اس عمل سے شیعوں ہی کے نہیں امریکیوں کے بھی نئے اور پرانے زخم ہرے ہو جائیں گے۔ تاہم ایک سابق بعثی بیوروکریٹ کو عام معافی دینا، موت کے دستے کے کسی زیر حراست رکن کو معافی دینے سے مختلف چیز ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی حکومت کو چلانے کے لیے ڈی نازی فکیشن کی کوشش کرتے ہوئے اتحادیوں نے بھی خاموشی کے ساتھ یہی کچھ کیا تھا۔ اب مالکی کو بھی یہی امتحان درپیش ہے کہ وہ اپنی حکومت میں سنیوں کے خلاف پائے جانے والی نفرت اور تعصب پر قابو پا کر یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں۔ جنرل کیسی سے اپنے انٹرویو کے اختتام پر میں نے پوچھا کہ عراق کی صورت حال کے حوالے سے ان کے انتہائی خدشات کیا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں سب سے زیادہ خطرہ عراقی قیادت سے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیادت ملک کو آگے لے جانے کے لیے ضروری سمجھوتے نہیں کرے گی۔ وہ ایسے بڑے اور وسیع البنیاد فیصلے نہیں کرے گی جو ملک کی مجموعی بہتری کے لیے مفید ہیں۔ وہ اپنے فرقہ وارانہ تعصب پر قابو نہیں پا سکے گی۔

بہت سے عراقیوں کے بقول ”ممکن ہے مالکی حکومت مفاہمت کی راہ اختیار نہ کرنے کی مجرم ہو مگر خود امریکا نے بھی عراق میں فرقہ وارانہ تقسیم کو روکنے کے لیے ایک فتویٰ جاری کرانے سے زیادہ

کچھ نہیں کیا۔ جس دن سے اس کی فوجیں عراق میں داخل ہوئی ہیں، امریکا نے بالکل متضاد رویہ اپنا رکھا ہے۔ عملی طور پر اس نے ملک کو نسلی گروپوں کے مجموعے کی حیثیت دی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ عملی رویے کے بالکل برعکس اس کا زبانی دعویٰ ہے کہ عراق کو تین ٹکڑوں میں بانٹنے کے بجائے اس کی وحدت کو قائم رکھنا امریکا کا مقصد ہے۔'' ایک عراقی صحافی کے مطابق عراق کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے مگر ان کا کوئی حل نہیں کیونکہ حکومت کی تشکیل ہی غلط ہوئی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ ''امریکا نے تمام معاملات کے لیے فرقوں اور فی صد کو بنیاد بنا رکھا ہے جبکہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ تمام عراقیوں کو ایک قوم سمجھا جانا چاہیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سنی ہیں یا شیعہ۔'' اس صورت حال کی روشنی میں شیعہ اور سنی آبادی کے درمیان خونریز فرقہ وارانہ تشدد کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ اس طرح یہ دونوں اپنے علاقائی کنٹرول کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں ہیں جس کا نتیجہ بالآخر ملک کے تین نسلی گروپوں کے درمیان تقسیم ہونے کی شکل میں نکلے گا۔ ایک انٹیلیجنس افسر کے مطابق ''سنی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ کھو رہے ہیں، شیعہ یہ نہیں مانتے کہ انہیں شراکت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور کرد کہتے ہیں کہ شیعہ اور سنی کبھی اپنی سوچ تبدیل نہیں کریں گے۔''

وفاقی نظام میں بصرہ اور رمادی بالترتیب شیعہ اور سنی علاقوں کے دارالحکومت ہوں گے جبکہ کرد علاقے کا صدر مقام اربیل یا کرکوک میں سے کوئی شہر قرار پائے گا۔ بغداد کی حیثیت ایک کمزور ریاست کے رسمی دارالحکومت کی سی رہ جائے گی جس کے ہاتھ میں خارجہ امور، تجارت اور اقتصادی پالیسی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ علاقوں میں جو ''نسلی صفایا'' ضروری ہے، عراقی شہریوں کے درمیان پچھلے کئی ماہ سے جاری باہمی تصادم اسی کی ایک شکل ہے۔ لیکن اگر اس سب کے نتیجے میں عراق ایک ایسا ہی وفاق بن گیا تو تیل کی قلت کا شکار سنی صوبے ان ہی گروپوں کے رحم و کرم پر ہوں گے جن سے وہ کچھ ہی دن پہلے ہلاکت خیز جنگ کرتے رہے تھے۔ تاہم عراقی دستور میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی رو سے تیل اور گیس کے موجودہ ذخائر سے ہونے والی آمدنی سے تمام عراقی یکساں طور پر استفادہ کریں گے اور وہ سب میں برابر تقسیم کی جائے گی۔ دستور پر

نظر ثانی کے دوران اس شق کو مستقل حیثیت دی جاسکتی ہے۔ جبکہ آئندہ دریافت ہونے والے ذخائر کا موضوع مزید بات چیت کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔

ان حالات میں سپریم کونسل برائے اسلامی انقلاب کی جانب سے عراق کو شیعہ اکثریت والے جنوبی صوبوں کے غلبے پر مبنی ایک وفاق بنانے کے منصوبے کو دو سال کے لیے مؤخر کر کے جس مصالحت کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے وہ گمراہ کن ہے۔ کرد پہلے ہی خودمختاری حاصل کر چکے ہیں جسے دستوری تحفظ بھی حاصل ہے اور دستور میں ان کی مرضی کے بغیر ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ مزید یہ کہ اس خودمختاری کے دفاع کے لیے عراقی فوج میں سابق کرد ملیشیا ''پیش مرگا'' کے دو ڈویژن موجود ہیں جو امریکی فوج سے 1990ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ جب میں نے کرنل گرے سے کردستان کے معاملے پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو اس کا جواب تھا: ''مکمل خودمختاری بالآخران کی منزل ہے۔ آزادی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔''

اس لیے سنی اور شیعہ جہاں آپس میں لڑ رہے ہیں، کرد وہیں اپنی سیاسی اور اقتصادی طاقت میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کی جانب سے غیر ملکی کمپنیوں کو اپنے علاقے میں سرمایہ کاری کے لیے انتہائی پرکشش پیشکشیں کی جارہی ہیں اور اس کے لیے قوانین بنائے جارہے ہیں۔ جون میں ناروے کی فرم ڈی این او نے یہاں تیل اور گیس کے نئے ذخائر دریافت کیے ہیں۔ 1958ء میں بادشاہت کے خاتمے کے بعد کے ادوار حکومت میں کرکوک اور اس کے نواحی علاقے میں ''عربنائزیشن'' کی پالیسی کے تحت عربوں کو، جن میں سے بیشتر شیعہ تھے، بڑے پیمانے پر بسایا گیا۔ انہیں تیل کی صنعت میں ملازمتیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں بعض اوقات لاکھوں کردوں کا قتل عام بھی کیا گیا اور انہیں اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تاکہ عربوں کے لیے گنجائش نکالی جاسکے۔ صدام حسین نے بھی 1990ء کی دہائی سے اپنی حکومت کے خاتمے تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اگرچہ کرکوک کے کردستان کا صدر مقام نہ بننے سے کردوں کی خودمختاری کے لیے کوئی سنگین مسئلہ پیدا نہیں ہوگا مگر اس حوالے سے یہ معاملہ ان کی نگاہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کردوں کا مطالبہ ہے کہ اس تاریخی غلطی کو درست کیا جائے اور جو کرد

اپنے گھر چھوڑ گئے انہیں اوران کواولاد کو واپس آنے کی دعوت دی جائے اوراس معاملے میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔عراق کے نئے دستور کی دفعہ 58 میں کردوں کے اس مطالبے کو پورا کرنے کی بات کی گئی ہے۔شیعوں اورسنیوں کے تنازع کی بناء پر کردوں کو طاقت کے توازن کے حوالے سے جو پوزیشن حاصل ہوگئی ہےاس کے سبب ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے شیعہ اکثریتی جماعت نے ان کا یہ مطالبہ مان تو لیا تھا مگر ابراہیم جعفری اس پر عمل کرانے میں ناکام رہے۔ یہ بات ان کے لیے کردوں کی حمایت ختم ہوجانے کا سبب بنی اوراس کے نتیجے میں انہیں وزارت عظمٰی سے محروم ہونا پڑا۔ ان کے بعد وزیراعظم مالکی بھی دستور کی اس دفعہ پرعمل کرانے میں کچھ زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کرسکے ہیں۔اسی دستو کی دفعہ 140 میں کرکوک میں مردم شماری اوراس کے بعد اس کے مستقبل پر ریفرنڈم کرانے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کام دستور کی رو سے 2007ء میں کیے جانے ہیں۔ یہ وعدے پورے ہوں یا نہ ہوں، بہرحال کرکوک کا معاملہ کردوں کے نزدیک بہت اہم ہے اور وہ اس کے لیے ضرورت پڑنے پر طاقت سے کام لینے کو بھی تیار ہیں۔ کرد علاقوں میں امریکی فوج اور عراقی نیشنل پولیس کے ساتھ عام شہریوں کا رویہ عراق کے دوسرے علاقوں کی نسبت بہتر ہے۔ یہاں فوج اور پولیس کو گشت کے دوران عام طور پر حملوں کا نشانہ نہیں بنایا جاتا جبکہ عرب علاقوں میں یہ روز کا معمول ہے۔ یہ مشاہدہ میں نے فوج کے ساتھ ایک گشت میں شریک ہوکر خود کیا۔اس کے بعد ہم نے بلیک ہاک ہیلی کاپٹر میں پرواز کرکے علاقے کا جائزہ لیا۔تیل،گیس اور بجلی کی تنصیبات کا مشاہدہ کیا۔ عراق کے قدرتی گیس کا ستّر اور تیل کا چالیس فی صد کرکوک کے گردونواح کے علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔کرنل گرے جیسے لوگ جو کردوں کو بخوبی جانتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ صدام حسین کے اقتدار کے خاتمے اوراس کے مظالم سے کردوں کو بچانے کے لیے اس کے دور میں کرد علاقے کو نوفلائی زون قرار دینے پر امریکا کے واقعی شکر گزار ہیں۔اس حد تک کہ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ کردستان کوئی امریکی ریاست ہونا چاہیے۔مزاحاً کہا جاسکتا ہے کہ وہ امریکیوں سے کہتے ہیں کہ ''یہاں ایک اڈہ بنالو''۔ یہ وہ بات ہے جسے بعض امریکی مبصر کردوں کے لیے علاقے میں استحکام اوراثر ورسوخ کا سبب

قرار دیتے ہیں تاہم دوسرے مبصرین کے نزدیک اس کے نتیجے میں امریکا ایک ختم نہ ہونے والے علاقائی جھگڑے میں پھنس جائے گا۔ اب تک واشنگٹن نے کردستان کے معاملے میں کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ دفتر خارجہ سے کسی کو خاص طور پر کرد علاقائی حکومت سے بات چیت کے لیے متعین نہیں کیا گیا۔ بعض مبصرین فکرمند ہیں کہ اس طرح وائٹ ہاؤس اہم اسٹرے ٹیجک روابط کے قیام کا ایک زبردست موقع ضائع کر رہا ہے۔ کرنل گرے کے بقول ''فی الوقت ہم تین نہیں، ایک ہی عراق چاہتے ہیں مگر اس موضوع پر امریکا میں مباحثہ ہونا چاہیے۔''

اس موضوع پر بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ واشنگٹن اور مغربی یورپ میں بعض لوگ اس بارے میں فکرمند ہیں کہ آزاد کردستان پر ترکی کا ردعمل کیا ہوگا۔ تاہم جو لوگ کردوں سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اربیل حکومت ترکی کے احساسات سے اچھی طرح باخبر ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے غیر معمولی اقدام کرتے ہوئے انقرہ کو یقین دہانی کرائی ہے کہ اس کی جانب سے کرد گوریلوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی اور ترکوں کے ساتھ تعلقات مشاورت اور اچھی ہمسائیگی کی بنیادوں پر استوار کیے جائیں گے۔ جاننے والوں کے مطابق ترکی اور ایرانی سرمایہ کار کرد علاقے میں بھاری سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ترکی یورپی یونین میں شمولیت کی جو کوشش کر رہا ہے وہ بھی کردستان کے ساتھ اس کے روابط کو اعتدال میں رکھنے کا سبب ثابت ہوگی۔

کرد منصوبہ کتنی مدت میں خودمختاری سے مکمل آزادی تک کا سفر طے کر سکتا ہے؟ وزیر اعظم مالکی کے ایک سینئر مشیر کا اندازہ ہے کہ کردستان دس سال میں آزادی حاصل کر کے علاقے میں امریکا کا بڑا فضائی اڈہ بن جائے گا۔ مگر بین الاقوامی کرائسس گروپ کی جولائی 2006ء کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کرد کرکوک کا شہر قانون یا سیاسی دباؤ کے ذریعے اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ایک پرتشدد تحریک نہ چلائیں تاہم ایسی صورت میں ان کے اقتدار کو عدم استحکام اور دائمی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پورے عراق میں فوجی دفاتر کی دیواروں پر ایک پوسٹر لگا ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی

فوجی جب عراق میں اپنا کام مکمل کرلیں تو عراق کو ایک ایسی ریاست ہونا چاہیے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ پرامن ہو، جس میں نمائندہ حکومت قائم ہو، جہاں سب کے انسانی حقوق کا یکساں احترام کیا جاتا ہو، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حلیف ہو۔ جس کی سیکوریٹی فورس داخلی سلامتی بھی مہیا کرسکتی ہو اور ملک کو دہشت گردوں کی جنت بننے سے بچانے کی بھی صلاحیت رکھتی ہو۔ تاہم جنرل پیٹرایورسن کے مطابق خود مختار وفاقی ریاستوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد خطرات سے خالی نہیں۔ وہ خبردار کرتے ہیں کہ عراق کی عملی تقسیم بیرونی طاقتوں کو معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی دعوت دینے کا سبب بن سکتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ صورت حال ترکی کو سرحد کی تبدیلی، ایران کو جنوب میں اثرات بڑھانے اور الانبار کے امام کے کنٹرول میں چلے جانے کے مواقع پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن ملک جس بحران میں مبتلا ہے اور آبادی جس طرح تقسیم ہو چکی ہے، اس کے متوقع نتائج سے صرف نظر نہیں ممکن نہیں۔

شکست کی قیمت

بڑی طاقتیں تاریخ بناتی ہیں اور چھوٹی طاقتیں تاریخ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ صدر نکسن نے ویت نام میں تاریخ بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس میں ناکام رہے اور امریکا کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اپنی تاریخ کی اس پہلی شکست کا امریکا کے عالمی کردار پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ 1960ء کی دہائی کے اواخر میں یہ بات واضح ہوگئی کہ چین اور روس میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اور امریکہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے سوویت یونین کے ساتھ کشیدگی کم کرنے اور چین سے تعلقات بحال کرنے کی پالیسی اپنائی۔ بالآخر ویت نام میں امریکا کی شکست کے باوجود سوویت یونین کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر عراق میں شکست کی صورت میں امریکا کے لیے ایسی کسی کامیابی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔ عراق میں شکست کا مطلب انتہائی مکروہ قوتوں یعنی صدام کے وفاداروں، مطلق العنانیت کی علمبردار بعثی تحریک کے کارکنوں اور ان جہادیوں کی کامیابی ہے جن کے

خلاف یہ جنگ شروع کی گئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ عراق کی شیعہ اکثریت پر مشتمل حکومت سنی بغاوت پر قابو پانے میں ناکام ہو جائے تو اس کا مطلب بھی ہارنے والی قوت یعنی شیعوں کے سرپرست ایران کی فتح ہو سکتا ہے۔ اگر ایک نفیس اور نرم دلانہ امن قائم نہ ہوا تو شیعہ سنیوں کے خلاف بغداد میں جاری خوفناک دہشت گردی کی مہم کو وسعت دیں گے۔ سنی اپنی مسلح تنظیموں کے ذریعے مزید حملے کر کے اس کا جواب دیں گے۔ وہ القاعدہ سے مزید افرادی قوت اور جدید ہتھیار مانگیں گے۔ سعودی عرب اور اردن سے بھی انہیں روایتی ہتھیار ملیں گے اور جنگ کی بھٹی سے گزر کر سخت جان ہو جانے والی سنی تحریک شیعوں کے خلاف زیادہ قوت سے نبرد آزما ہوگی۔ نتیجتاً شیعوں کے لیے بغداد کا دفاع مشکل ہو جائے گا اور بغداد ایک تہذیبی مرکز کے بجائے مستقل طور پر بھیانک نسلی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کا گڑھ بن کر رہ جائے گا۔ طاقتور ایرانی سرپرستی کے ساتھ شیعہ جنوب میں اپنی طاقت مرتکز کریں گے تو سنی پرانے نسلی اختلافات بھلا کر مسلکی ہم آہنگی کے سبب شمال میں قائم ہونے والی آزاد کرد ریاست کی طرف دیکھیں گے۔ ان حالات کا نتیجہ انتہائی خوں ریز جنگ کی شکل ہی میں نکل سکتا ہے۔ اس دوران ایران، شمالی کوریا، اسرائیل اور شام میں کیا ہوگا؟ جن میں سے اول الذکر کی طویل فاصلوں تک مار کرنے کی صلاحیت واضح ہو چکی ہے؟ اور نیویارک، لاس اینجلس، شکاگو اور دوسرے امریکی شہروں میں کیا ہوگا؟ یہ وہ فرق ہے جو اتفاقاً کسی دہشت گرد حملے کا نشانہ بن جانے اور دہشت گردوں کے مقابلے میں جنگ ہار جانے میں ہے۔ اس لیے ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے امریکا کو اسی چابکدستی سے جوابی کارروائی کرنی چاہیے جیسے افغانستان کے خلاف نائن الیون کے بعد کی گئی اور جس کے نتیجے میں ملک کا وقار بحال ہو گیا۔ ایک غیر منظّم شورش سے خائف ہو کر افرتفری کے عالم میں راہ فرار اختیار کرنے کی صورت میں آپ اپنے آپ کو ان عناصر کے زیادہ بڑے حملے کی زد میں پائیں گے جو بین الاقوامی اختلافات کو تہذیبوں کے تصادم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ایسے علاقے میں جہاں مخالفانہ نقطہ نظر رکھنے والوں کے نزدیک بھی امریکا کے اہم مفادات ہیں، شکست کھا جانا ناقابل برداشت ہے۔ عراقی شہریوں کی جانوں کے تحفظ کا معاملہ بھی اہم ہے جو اتحادی افواج سے کئی گنا

زیادہ جانی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ وقت سے پہلے امریکی افواج کی واپسی ان کی جانوں کے لیے نہایت سنگین خطرات پیدا کردے گی۔ اس لیے فتح کے حوالے سے ہم اپنے نقطہ نظر کی نئی تعریف تو کرسکتے ہیں مگر شکست قبول نہیں کرسکتے۔

فتح کے امکانات بڑھانے کے اقدامات

امریکی اتحادی افواج کی تعداد کبھی بھی ضرورت کے مطابق نہیں رہی۔ شہریوں کو تحفظ مہیا کرنے، باغیوں سے نمٹنے، سرحدوں سے مزاحمت کاروں کی آمد روکنے، اور گیس و تیل کے ذخائر کی حفاظت کرنے کے لیے جتنے سپاہی درکار ہیں، کبھی بھی ان کی تعداد اتنی نہیں رہی۔ تاہم اب 2007ء کے اختتام تک 160000 عراقی فوجیوں کی تربیت مکمل ہوجانے سے امریکا کے لیے مناسب فوجی نفری کے ساتھ دو اہم ترین فوجی چیلنجوں سے نمٹنے کی راہ ہموار ہورہی ہے۔ ان میں سے ایک بغداد کی حفاظت اور دوسرا الانبار کے باغیوں سے جنگ ہے۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ افواج کی موجودہ تعداد برقرار رکھی جائے یا مزید بڑھائی جائے۔ امریکا عراقی نیشنل پولیس کے معیار پر پورے اترنے والے ارکان سے بھی کام لے سکتا ہے۔ امریکی فوج کی واپسی کو واقعات سے نہیں سیاسی سمجھوتے سے مشروط کیا جانا چاہیے۔ جب سیاسی طور پر معاملات درست ہوجائیں، فوج کی واپسی شروع کردی جائے۔

سنیوں کو ایسی پیش کش کرنے کے لیے جسے وہ مسترد نہ کرسکیں بغداد حکومت کے ساتھ مل کر کام کیا جانا چاہیے۔ بغاوت ختم کرنے کی صورت میں انہیں بہتر سے بہتر صلہ دیا جانا چاہیے جبکہ مزاحمت ختم نہ کرنے کے نتائج کو سنگین تر بنایا جانا چاہیے۔ سنیوں کو بغاوت ختم کرنے، عراقی دستور کو تسلیم کرنے اور القاعدہ اور دیگر بیرونی مداخلت کاروں سے روابط ترک کرنے کے اعلان کا موقع مہیا کیا جانا چاہیے۔ اس کے بدلے میں حکومت کی طرف سے سب کو عام معافی دے دینی چاہیے سوائے صدام کے ان ساتھیوں اور ان افراد کے جو پہلے ہی جنگی جرائم وغیرہ کے ملزم یا مجرم کی حیثیت سے زیرحراست

ہیں اور جن کے جرائم کا تعلق موجودہ تنازع سے نہیں ہے۔ اس عام معافی میں ان لوگوں کی سابقہ سول اور فوجی ملازمتوں پر بحالی بھی شامل ہوگی۔ اس پیش کش پر بات چیت کے دوران ملیشیا تنظیموں کے درمیان مؤثر جنگ بندی ہونی چاہیے اور اس پر مکمل عمل درآمد کرایا جانا چاہیے۔ سنیوں کی جانب سے اس پیش کش کے قبول کر لیے جانے پر تمام ملیشیا تنظیموں کو ختم کر دیا جانا چاہیے سوائے ان کے جو پہلے ہی عراقی نیشنل فورس میں ضم ہو چکی ہیں یا جو اس پر آمادگی ظاہر کر چکی ہیں۔ اس سمجھوتے پر عمل کرانا اتحادی افواج کی پہلی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ سنی اکثریت کے صوبوں کو تیل اور گیس کے موجودہ ذخائر سے یکساں استفادے کا حق دیا جانا چاہیے جبکہ نئے دریافت ہونے والے ذخائر ان ہی علاقوں کے لیے مختص کیے جا سکتے ہیں جہاں یہ ذخائر دریافت ہوں۔ سنیوں کو ضمانت دی جانی چاہیے کہ تیل کی آمدنی میں ان کے سالانہ حصہ کے تناسب میں کم از کم پندرہ سال تک کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اگر شیعہ اکثریت والی حکومت ایسا کوئی مفاہمتی منصوبہ نہ پیش کر سکے تو امریکا کو امریکی تجویز کے طور پر اسے آگے بڑھانا چاہیے۔ اگر سنی اس منصوبے کو قبول کر لیں تو امریکا کو عراق کے سنیوں اور کردش علاقائی حکومت کے لوگوں کو اپنی حکومت چلانے کی خاطر معاشی اور سیاسی معاونت فراہم کرنے کے لیے بنائے جانے والے علاقائی استحکام اور اقتصادی ترقی کے منصوبے پر علاقے کے دوسرے سنی دوست ملکوں ترکی، سعودی عرب، اردن اور مصر کو شریک کر کے عمل شروع کر دینا چاہیے۔ اگر سنی اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو امریکی اور عراقی فوج کو اپنی بہتر عددی قوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الانبار کے صوبے میں فوجی فتح کے لیے ایک بڑی جارحانہ مہم شروع کر دینی چاہیے۔

مضبوط مرکزی حکومت یا وفاقی ریاستوں کا ڈھیلا ڈھالا اتحاد، عراق کو ان میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا ہے۔ سنی کئی وجوہ سے مضبوط مرکزی حکومت کے خواہاں ہیں۔ وہ ایسی حکومتوں کے تحت، اقلیت میں ہونے کے باوجود، شیعہ اکثریت پر غالب رہے ہیں۔ عراق میں شیعوں کی عددی برتری کے باوجود سنی خود کو اس بناء پر اقلیت تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا کی مسلمان آبادی میں ایک شیعہ کے مقابلے میں 9 مسلمان سنی ہیں۔ مضبوط مرکزی حکومت کے لیے امریکی کوشش ان کے لیے امید کی

کرن ہے۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ اس طرح انہیں فوج اور حکومت میں پھر پاؤں جمانے کا موقع مل جائے گا اور وہ دوبارہ اقتدار میں آجائیں گے۔ تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا مضبوط مرکزی حکومت امریکا کے مفاد میں ہے۔ اگر سنیوں کی یہ سوچ درست ہے تو کیا مضبوط مرکزی حکومت ایک ایسے گروہ کو زیادہ تیزی سے اوپر لانے اور طاقتور بنانے کا سبب نہیں بنے گی جنہوں نے عراق میں امریکا کی آمد کے بعد کم از کم تین سال تک حتی الامکان اس کے زیادہ سے زیادہ فوجیوں کو ٹھکانے لگانے کا کام کیا ہے۔

اگر سنی عراق میں دوبارہ ابھرنے میں ناکام ہوئے تو تقریباً یقینی طور پر یہ ایران کی جانب سے شیعوں کی فوجی تنظیم، تربیت اور مالی امداد کی وجہ سے ہوگا۔ جبکہ امریکا میں عراق کے لیے منصوبہ بندی دوسرے خطوط پر کی گئی تھی۔ امریکا میں شیعوں کو بحیثیت عراقی سے سب سے بڑھ کر محبِّ وطن سمجھا جاتا تھا۔ 1980ء کی دہائی میں وہ ایران کے خلاف جنگ میں شریک رہے تھے۔ وہ عراق میں جمہوریت چاہتے تھے اور ایران کی مذہبی حکومت ان کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ امریکیوں کے نزدیک عراق بنیادی طور پر سیکولر ملک تھا۔ لیکن امریکی منصوبے میں 1991ء کی جنگ خلیج کو نظر انداز کر دیا گیا جس کے بعد کے برسوں میں ایک امریکی صدر نے عراقیوں کو صدام حسین کی آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر ابھارا۔ لیکن اس کے بعد جب اس کے ری پبلکن گارڈز کے دستوں نے ہیلی کاپٹروں سے حملے کر کے تین لاکھ عراقی شہریوں کو ہلاک کر ڈالا تو امریکا خاموش تماشائی بنا رہا۔ ان حالات میں پناہ کے متلاشی دسیوں لاکھ عراقیوں کا ایران میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ ان میں سے لاکھوں افراد اب عراق واپس آچکے ہیں۔ یہ لوگ مقامی مسجد اور بازار سے لے کر پولیس اسٹیشن اور ملیشیا یونٹ تک کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ امریکی منصوبہ سازوں کی توقعات کے برعکس عراق کی شیعہ آبادی امریکا کی نسبت تہران سے زیادہ گہرے روابط رکھتی ہے۔ امریکا سمجھتا تھا کہ عراقی قوم پرستی ایران کے خلاف ایک حفاظتی دیوار بن جائے گی مگر حالات عراق میں شیعہ تشخص کو ابھارنے کا سبب بن گئے ہیں۔

اس طرح عراق کے شیعہ اور سنی میدان جنگ سے لے کر ایوان نمائندگان تک مفادات کے

تحفظ کی ایک ایسی کشمکش میں الجھ گئے ہیں جس میں سب سے بڑا فاتح ایران ہوگا اگرچہ تکنیکی طور پر وہ اس کھیل میں شریک نہیں ہے۔اس لیے امریکا کو کسی بھی صورت مفاہمتی کوششوں میں ایران کو شرکت کی دعوت دے کر اس کی فتوحات کے دائرے کو بڑھانا نہیں چاہیے۔ایسا کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ عراق کے موجودہ تنازع میں ایران کی شرارتوں کو جواز مل جائے گا بلکہ اس کے جوہری پروگرام کی تکمیل کی راہ بھی ہموار ہوجائے گی اور یہ صورت عراق کے موجودہ حالات سے زیادہ المناک اور زیادہ دوررس نقصانات کی حامل ہوگی۔

کرد پہلے ہی خودمختاری اور پھر آزادی کے حصول کا ایک منصوبہ رکھتے ہیں جس پر عمل جاری ہے۔تاہم ان کا مقصد عراق پر یا خطے میں غلبہ اور تسلط حاصل کرنا نہیں ہے۔ان کے پاس تعمیر و ترقی کے لیے ایک قابل عمل نظام بھی ہے اور تیل سے منافع کمانے کے مواقع بھی۔انہوں نے تیل کی پیداوار بڑھانے اور اسے مارکیٹ میں لانے کے لیے کام بھی شروع کر دیا ہے۔ان کے نزدیک ان کے علاقے میں امریکی فوجی اڈہ انہیں مکمل تحفظ فراہم کرے گا۔ممکن ہے کہ یہ وقت اس خیال کو اپنا لینے کے لیے موزوں نہ ہو لیکن اسے مسترد کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔اس وقت کھیل کا نام لچکداری ہے۔ایسی صورت میں جب بھاری نقصانات کا سامنا ہو، تمام قابل عمل راستوں کو کھلا رکھا جانا چاہیے۔موجودہ تنازع میں امریکا کو اپنا کردار پوری طرح ادا کرنا اور علاقے میں اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہیے۔اس کے لیے کافی دلائل موجود ہیں۔اگر عراق تقسیم ہوتا ہے تو امریکا کو کردوں سے مستحکم تعلقات استوار کرنے چاہئیں۔ایسا کرنا آسان نہیں ہے مگر یہی وہ راستہ ہے جسے اپنا کر امریکا دنیا کے ایک ایسے خطے میں اپنی موجودگی موثر طور پر برقرار رکھ سکتا ہے جہاں اس کے مفادات یقیناً نہایت اہم ہیں۔

☆☆☆